Chapter - 5

باب پنجم

ساحر کی غزل گوئی

ہر عہد کی اپنی قدریں اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو بتدریج بدلتے ہوئے عہد کے ساتھ تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ قدروں اور تقاضوں کی یہ تغیر پذیری ایک طرف تو رجحانات و میلانات کی تبدیلی کا سبب بنتی ہے اور دوسری طرف سیاسی و سماجی حالات اور فکری و تخلیقی عمل کا تعین بھی کرتی ہے۔ اس روشنی میں تغیر و تبدل کا پرتو نہ صرف موضوعاتی سطح پر ہی نظر آتا ہے بلکہ اس کی جھلک ہیئتی سانچوں میں بھی بہت نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس لحاظ سے غزل بلاشبہ اردو شاعری کی سب سے نمایاں اور سب سے مقبول صنفِ سخن رہی ہے۔

اردو شاعری کے اس طویل سفر میں، یعنی آغاز تا حال، ہمیں غزل کے ساتھ مثنوی، قصیدے اور مرثیے وغیرہ بھی نظر آتے ہیں مگر چوں کہ یہ اصناف مخصوص عہد اور مخصوص مزاج کی پیداوار تھیں اس لیے اپنے عہد کے ساتھ ہی رہ گئیں اس کے برخلاف غزل نے ہر دور میں خود کو زندہ رکھا گو اس پر مصائب و ابتلا کا سایہ بھی پڑا تاہم کوئی بھی صنفِ سخن ایک عرصہ تک اپنی مقبولیت قائم رکھے تو یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں زمانے کے تغیرات و انقلابات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور بلا مبالغہ یہ صلاحیت غزل میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور اس کی

ایک نمایاں مثال ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی ہے ۔ حالانکہ ساحر سے متعلق ایک عام خیال یہ رواج پاگیا ہے کہ وہ نظم کے شاعر ہیں نتیجتاً ان کی غزلوں پر نہ صرف توجہ نہیں دی گئی بلکہ ان کو سمجھنے اور سمجھانے سے گریز بھی کیا گیا ۔ چنانچہ ان کی غزلیں، ان کی نظموں کے سائے میں معدوم ہوگئیں ۔ البتہ کچھ ناقدین نے ساحر کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ضمناً ان کی غزلوں پر بلکہ چند اشعار پر ناقدانہ نظر ضرور ڈالی ہے تاہم مجموعی طور پر ان کی غزلوں پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی ۔ یہ صحیح ہے کہ ساحر نے غزلیں کم کہی ہیں لیکن ان میں اکثر غزلیں ایسی ہیں جو نہ صرف غزل کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں بلکہ ان غزلوں کو بیسویں صدی کی بہترین اور پر معنی غزلوں کے مد مقابل رکھ سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں پروفیسر نظیر صدیقی کا خیال بے حد اہم ہے، لکھتے ہیں :

> اگرچہ ساحر نے نظمیں زیادہ کہیں، لیکن وہ اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جو نظم و غزل پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور میرے ایک نظریہ کے مطابق ان کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ ایک کامیاب غزل گو تھے ۔ یہ بات جس طرح اقبال اور فیض پر صادق آتی ہے اسی طرح ساحر پر بھی منطبق ہوتی ہے ۔ [۱]

غزل کی فضا ایجاز و اختصار کی متقاضی ہوتی ہے کیوں کہ دو مصرعوں میں پورے خیال کو سمیٹنا پڑتا ہے چنانچہ تفصیل کے بجائے اختصار اور وضاحت کی جگہ ایمائیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اسی سے غزل کی فضا بنتی ہے اور یہی غزل کا خاص فنی وصف بھی ہے ۔ اور یہ صورت استعاروں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے ساحر کی غزلوں میں استعاروں کی کمی نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ساحر ان

[۱] بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی ساحر لدھیانوی نمبر ص ۲۸۸

معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنھیں استعارے تراشنے اور ان کے برمحل استعمال کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں صفات سے تغزل پیدا ہوتی ہے وہیں الفاظ اور استعارات کے ذریعہ کیفیت پیدا کرنے کا ہنر بھی انھیں خوب آتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ساحر ان دونوں کوششوں میں کامیاب ہیں۔
فریڈرک اینگلز اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> مقصدی میلان کو اشاروں کے ذریعہ بے ساختہ اور غیر محسوس طور پر اثر ڈالنا چاہیے اس کی ضرورت نہیں کہ مصنف اپنے خیالات اور عقائد کا ڈنکا پیٹ کر زبردستی پڑھنے والے پر اپنا اثر ڈالے۔ [۲۵]

پھر آگے بہت صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ:

> مصنف کے نظریات جس قدر پوشیدہ رہیں فنکاری کے حق میں اسی قدر بہتر ہوتا ہے۔ [۲۳]

اینگلز نے جس بے ساختگی اور اثر پذیری کی بات کی ہے غنائیت میرے خیال میں اس سے الگ کچھ اور نہیں اور مصنف کے نظریات کی پوشیدگی کا جو احساس دلایا ہے اس کا تعلق رمزیت و اشاریت سے بہت گہرا ہے بہ الفاظ دیگر یہ جملہ اوصاف و عناصر غزل کا خاصہ ہیں اس لحاظ سے غور کریں تو یہ بات وضاحت طلب نہیں رہ جاتی کہ ساحر لدھیانوی صحیح معنوں میں ترقی پسند ہیں اور سچے ترقی پسند ہیں چنانچہ جب وہ یہ کہتے ہیں:

> کون جانے یہ ترا شاعر آشفتہ مزاج
> کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے ۴۶

[۲۵] بحوالہ ادب اور زندگی: مجنوں گورکھپوری ص ۱۹۰
[۲۳] ایضاً ایضاً ص ۱۹۱

تو یہ حالات و ماحول کے اس روایتی جبر کے خلاف ردِ عمل کا اظہار ہے جو ہر زمانے میں شکلیں بدل بدل کر عام انسانی زندگی کی ترقی کو بالعموم اور محنت کش عوام کی خوش حالی کو بالخصوص التوا میں ڈالتا رہا ہے نیز برطانوی سامراج اور جاگیرداری نظام کے استبداد کے خلاف احتجاجی رویہ ہے جس کے سبب نہ صرف افلاس زدہ عوام اور مزدور اور کسان بے بسی کے عالم میں جینے پر مجبور ہیں بلکہ ان فرسودہ سماجی و تہذیبی اصولوں کے زیر اثر رفاقت و محبت بھی رسم و رواج کا شکار ہوتی ہے۔

اس شعر کی معنویت مغرور خداؤں کی علامت سے ابھری ہے اور اس کی صفاتی ترکیب سے غزل کی فضا ہموار ہوئی ہے اور دراصل اسلوب کی یہی خصوصیت ساحر کو تہہ دار غزل گو بناتی ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ساحر کی غزلوں میں تقریباً وہی خیالات اور وہی نظریات کارفرما ہیں جو ان کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہیں اور غزلوں کے موضوعات بھی کم و بیش وہی ہیں جو ان کی نظموں میں جاری و ساری ہیں۔ بایں ہمہ عشق کی ناکامی کا احساس ہو یا ملک کی آزادی کا مسئلہ، زمانے کی ناقدری کی شکایت ہو یا سماجی و تہذیبی اقدار کی پامالی کی فکر، عوامی زندگی کے مسائل کا احساس ہو یا تقسیم ملک کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کا المیہ، ساحر نے ہر معاملہ کی باریکی کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ساحر کی غزلیں کتابی علم سے مشتق نہیں ہیں بلکہ ان کے تجربات کی دین ہیں کیوں کہ جن تجربات و حادثات سے وہ دوچار ہوئے وہی ان کے جذبہ و احساس سے گزر کر اشعار میں ظاہر ہوئے، اور ساحر کا یہ کہنا کہ:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اسی خیال کا حقیقت پسندانہ اظہار ہے۔ لیکن ساحر کے یہاں شاعری موضوعات

کہ انتخاب کا نام نہیں بلکہ زندگی کے اظہار کا نام ہے:

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب!
ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں ؎

اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی ؎

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے ؎ فرد

اب اے دلِ تباہ! ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے ؎

جس میں خلوصِ فکر نہ ہو وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو اس لے میں کچھ نہیں ؎

ان اشعار میں ساحر کے سماجی شعور کی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے کیوں کہ زندگی اور زمانے سے متعلق ان کا یہ رویہ عصرِ حاضر کی سماجی و سیاسی اقدار اور خود ساحر کے حالات و ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس لحاظ سے مجنوں گورکھپوری کا یہ خیال اہم ہو جاتا ہے کہ

ادب انسان کے جذبات و خیالات کا ترجمان ہے اور انسان کے جذبات و خیالات تابع ہوتے ہیں زمانے اور ماحول کے۔ جیسا دور اور جیسی معاشرت

"ہوگی ویسے ہی جذبات و خیالات ہوں گے اور پھر ویسا ہی ادب ہوگا۔[۴۲]

ساحر کا عہد سماجی و سیاسی لحاظ سے برطانوی نو آبادیاتی نظام کے معاشی و معاشرتی اور تہذیبی تسلط اور ہندستان کی سماجی و تہذیبی اقدار اور سیاسی و اقتصادی حالات کے انتشار کا زمانہ تھا جس کے منفی اثرات عوامی زندگی اور طبقاتی روابط پر بہت شدید تھے چنانچہ اجتماعی زندگی کی مجبوریاں اور ان کے آلام و مصائب ساحر کے تجربات کا حصہ بنے حالانکہ ساحر پر یہ الزام بھی آیا کہ محنت کشوں اور مزدوروں کے ساتھ ان کی یہ ہمدردی ترقی پسند تحریک سے تقرب و وابستگی اور نظریاتی دباؤ کا نتیجہ تھی لیکن جیسا کہ سوانحی باب میں ذکر ہو چکا ہے کہ ساحر کی ابتدائی زندگی کا زمانہ بجائے خود ان کے لیے اذیت ناک ہے جو والدین کے مابین کشیدگی اور تنازعات کی شکل میں ان پر اثر انداز ہوا دوسری طرف خود ان کے بیان سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ کسانوں کے ساتھ جاگیرداروں کا رویہ کس حد تک غیر انسانی تھا مزید برآں کوئلہ چننے والی ان عورتوں کا ذکر بھی ہو چکا ہے جن کی معاشی بدحالیوں اور مجبوریوں کا راست اثر ساحر کے جذبہ و احساس پر ہوا اور جس کی طرف جوش ملیح آبادی نے بھی اپنی نظم "حسن اور مزدوری" میں اشارہ کیا ہے اور ان کی بے بسی اور کسمپرسی کا احساس دلایا ہے اسی لیے انھوں نے دستِ نازک کو رسن سے چھڑانے کا حوصلہ بخشا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ساحر کی غزلوں میں سماجی کشمکش اور ناسازگاریِ حالات کا اسقدر گہرا احساس نظر آتا ہے۔ اور اسی لیے انھوں نے ادب کو اجتماعی زندگی کا ترجمان بنانے پر زور دیا اور پسماندہ اور محنت کش طبقوں کے آلام و مصائب اور ان کی زندگی کے مسائل کی

[۴۲] ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری ص ۵۱

شکاسی کو فن کا معیار ٹھہرایا:

فن جو نادار تک نہیں پہنچا
اپنے معیار تک نہیں پہنچا ؔمُو

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں
اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے ؔمُو

زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی ؔمُو

اے غمِ دنیا! تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی ؔمُو

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی ؔمُو

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم ؔمُو

کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی ؔمُو

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے ؔمُو

اپنی کم مائیگی اور بے بسی کے احساس اور حالات کی سختیوں سے بوجھل زندگی کا مارا ہوا انسان اس کے علاوہ کہہ بھی کیا سکتا ہے۔

ادب اور سماج کا مطالعہ کرنے والوں میں لوکاچ ایک اہم نقاد کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس نے اپنی تصنیف میں ادب اور سماج کے باہمی رشتوں پر بحث کرتے ہوئے ادب کو سماجی اور اقتصادی حالات کا ترجمان بتایا لیکن وہ ادب کو محض سماج کا آئینہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ اسے زندگی کا نقاد اور سماج کا پیش رو قرار دیتا ہے، لکھتا ہے :

Literature is one step ahead to society because it is not only reflecter but critical too.[۵۵]

آگے چل کر اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے :

The self-containment of the work of art is therefore the reflection of the process of life in motion and in concrete dynamic context.[۵۶]

ان خیالات کے مد نظر اگر ساحر کی غزلوں کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ساحر کے یہاں صرف ادب کی افادیت اور مقصدیت پر ہی زور نہیں ملتا بلکہ ان کی شاعری میں زندگی کی متحرک تصویریں نظر آتی ہیں ۔ میلی کچیلی، بوسیدہ اور خوش رنگوں سے محروم ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے سماج کو بدل ڈالنے کے خواہاں ہیں جس میں انسان کو انسانوں کی طرح جینے کا حق نہ ملے ، ذاتی مفاد کی خاطر جہاں مظلوم اور مجبور عوام کی محنت کا استحصال ہو ، عورتوں کا تقدس ، تمدن کی نذر ہوتا ہو ، ارباب اقتدار صرف اپنے اقتدار کی بحالی کی خاطر عام انسانی زندگی کے حقوق کو پامال کرتے ہوں اور مذہب کے نام پر معصوم مگر ناخواندہ لوگوں کے جذبات

۵۵، ۵۶ Writer and Critic - Lukács P 37

کا استحصال کیا جاتا ہو، اسی لیے ساحر کے یہاں احتجاج و انقلاب کا یہ رویہ بہت شدید ہے:

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم ؎

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارہ نہیں ہوتی ؎

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم ؎

اس رینگتی حیات کا کب تک اٹھائیں بار
بیمار اب الجھنے لگے ہیں طبیب سے ؎

اس دورِ احتیاج میں جو لوگ جی لیے
ان کا بھی نام شعبدہ کاروں میں آئے گا ؎

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں ؎

یہاں ساحر کا سماجی شعور ان کے طبقاتی احساس سے پوری طرح ہم آہنگ ہوا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے خود کہتے ہیں:

شاعر کی خود کی شخصیت، اس کے فن اور اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اپنا ایک حلقہ ہوتا ہے اسی کے مطابق موضوع اور اسلوب کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے، میں مزاجاً متوسط طبقہ

سا فر دہوں ---- میں اسی ماحول سے نکلا ہوں اس
سے متاثر ہونا فطری ہے۔ ۵۷

پھر آگے لکھتے ہیں:

آرٹ فنکار کے تجربات کا اظہار ہے۔
ہر ادیب اپنی نظر سے اپنے ماحول کو دیکھتا ہے
اور اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ ۵۸

حالانکہ ساحر خاندان کے لحاظ سے جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا ذکر انھوں نے اپنی نظموں میں بھی کیا ہے لیکن والدین کے مابین تنازعات نے ان کو والدہ سے قریب کیا جن کا تعلق متوسط طبقہ سے تھا۔ چنانچہ ان تنازعات نے جاگیرداری نظام کے تئیں ان میں نفرت بھر دی اور انھوں نے جاگیرداروں اور کسانوں کے مابین کشاکش اور جاگیرداروں کے استحصالی رویوں کے خلاف نہ صرف احتجاج ہی کیا اور اس کی مذمت ہی کی بلکہ اس نظام سے بغاوت اور پسماندہ لوگوں، مزدوروں اور کسانوں کی ہمیشہ حمایت بھی کی اسی لیے خود کو ان کی نسبت سے متوسط کہا اور زندگی بھر ان کے ساتھ یا ان کا درد لے کر جیتے رہے بالفاظِ دیگر ان کا دل عوام کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکا ہے کیوں کہ تعفن زدہ ماحول میں رہنے والے انسانوں کی حالت ان سے پوشیدہ نہیں ہے چنانچہ شدتِ احساس سے تنگ آ کر چیخ اٹھتے ہیں:

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں ۵۹

ستم کے بہت سے ہیں ردِ عمل — ضروری نہیں چشم تر کیجیے

۵۷ بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۶۳
۵۸ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۶۴

ساحر کی اس اضطرابی کیفیت کا تعلق ان کے طبقاتی شعور اور ان کی عصری حسیت سے بہت گہرا ہے کیوں کہ اسی اضطراب و بےچینی نے ان کے طبقاتی شعور کو ابھارا ہے اور اسی نے ان کو اجتماعی زندگی کے دکھ درد کا مغنی بھی بنایا ہے ۔ ساحر کا یہ طبقاتی احساس حسن و عشق کی وارداتوں اور ہجر و وصال کی کیفیتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ احساس ان کی پوری شاعری کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اسی احساس سے فکر کے متنوع دھارے پھوٹتے اور اشعار کا روپ دھارتے ہیں ۔

عاشق کا کام محبوب کی یادوں میں گم رہنا ، ہجر میں تڑپنا ، اور عشق کی رنگینیوں میں غرق ہو کر خود کو بھلا دینا ہے لیکن دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح ساحر کے یہاں بھی عشق کا جو احساس ابھرتا ہے وہ عنفوانِ شباب سے گزرتے ہوئے نوجوان عاشق کے جذبات و خیالات کو منعکس کرتا ہے جو زمانے کے سرد و گرم کا شدید احساس بھی رکھتا ہے اور اس سے محفوظ بھی نہیں ہے لیکن گریہ و زاری اور محبوب کی یاد میں خود کو گم کر دینے کا رویہ کم از کم ان شعراء کے کلام میں نہیں ملتا تاہم اس احساس سے وہ بھی نکل نہیں پائے ہیں :

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے ﴿ فیض احمد فیض

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے ﴿ فیض احمد فیض

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے ﴿ مجروح سلطانپوری

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے ، کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی ، واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے ﴿ مجاز لکھنوی

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا ہے دلِ بے اختیار نے ؎ ساحرؔ

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے ؎ ساحرؔ

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دہرائی گئی ؎ ساحرؔ

حالانکہ فیضؔ، مجازؔ اور مجروحؔ کی ابتدائی غزلوں میں فلسفۂ حسن و عشق سے متعلق اسلوب کی رنگا رنگی تو نظر آتی ہے اور ایک طرح کی محرومی و اداسی کے ساتھ حسن و عشق کا لطیف و نازک احساس بھی ابھرتا ہے لیکن کوئی نظریاتی تغیر رونما نہیں ہوتا اس کے برخلاف ساحرؔ کے یہاں وارداتِ قلب کے پرکیف بیان میں بھی حقیقت اور احتجاج کا عنصر پوشیدہ ہے اور ان تغیرات کی جھلک ان کی اولین غزل کے پہلے شعر

محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے ؎

میں ہی مل جاتی ہے۔ حالانکہ ساحرؔ کے اس شعری رجحان سے متعلق ایک عام خیال یہ بھی رواج پا گیا ہے کہ زمانہ اور سماج سے متعلق ان کا یہ رویہ ترقی پسند تحریک کی دین ہے جو نظریے کی شکل میں سامنے آیا ہے لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں بھی عرض کیا گیا اور ساحرؔ کے اس میلان کی طرف واضح اشارہ بھی کیا گیا کہ ساحرؔ اگر ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ بھی ہوتے تو بھی احتجاجی رویہ سامنے آتا کیوں کہ بچپن سے انھیں جس طرح کا سماجی و سیاسی ماحول ملا، جس طرح کے خاندانی ماحول سے سابقہ پڑا اور وہ جس طرح کی تہذیبی روایت اور جس

طرح کے رسوم وعقائد سے دوچار ہوئے حساس طبع ہونے کے سبب ان سب کے گہرے اثرات ان پر مرتب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عاشقانہ جذبات کے اظہار میں بھی زمانے کی متنوع حقیقتیں جلوہ نما ہیں:

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے مہ

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم مہ

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے مہ فرد

تم میرے لیے اب کوئی الزام نہ ڈھونڈو
چاہا تھا تمھیں اک یہی الزام بہت ہے مہ فرد

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے مہ

تمھارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں مہ

ساحر کے اس اجتماعی شعور سے متعلق ناز صدیقی اپنے خیالات کا

اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

عشق کے تجربات اور مسائل کے تعلق سے ساحر کا وہی مخصوص رویہ جھلکتا ہے جو ان کی عشقیہ نظموں میں بھی نمایاں ہے اس عشق میں محبوب کے قرب وصال کی گھڑیاں بہت مختصر رہی ہیں۔ اول تو غمِ دوراں نے اس کی مہلت کم دی پھر سماج نے ان چاہنے والوں کے درمیان مستقل طور پر دیواریں کھڑی کر دیں۔ چنانچہ اس قسم کے اشعار جن میں آغازِ محبت، عشق کی کیفیات اور معاملات کا بیان ہو ساحر کی غزلوں میں خال خال ہی ملتے ہیں۔ ۵۹

لہذا ان کے یہاں خالص عشقیہ جذبات کے اظہار میں بھی سماجی شعور اور عصری حسیت و آگہی نمایاں ہے۔ جو رومانیت کی رنگینیوں سے حقیقت کی سنگینیوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ حالانکہ عشق کی ناکام حسرتوں سے وہ زندگی بھر پیچھا نہ چھڑا سکے لیکن ان مسائل کے حل کے لیے وہ تاعمر سرگرداں رہے۔ جس کا بھرپور احساس ان کی نظم پرچھائیاں میں ابھرا ہے۔ اسی احساسِ عشق سے ان میں ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہوا ہے اور اسی جذبہ نے ان کو انسان دوستی کی طرف مائل بھی کیا ہے لہذا ان کے یہاں تعمیرِ زندگی کے ساتھ ساتھ عظمتِ انسان کا تصور بھی نمایاں ہوا ہے:

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بامِ حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے شعر

ہم نے خزاں کی فصل چمن سے نکال دی
ہم کو پیامِ مرگِ بہاروں میں آئے گا شعر

۵۹ ساحر: شخص اور شاعر ص ۱۳۴

تیرے لہو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی
مے کے ہزار وصف سہی مے میں کچھ نہیں مؤ

ہم کو ان سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے مؤ

عظمتِ انسان کا یہ تصور ساحر کی غزلوں کا اساسی پہلو ہے۔ لیکن یہ انسان غم زدہ یا شکست خوردہ نہیں ہے بلکہ خوددار بھی ہے اور حالات کی قید و بند سے نبرد آزما بھی۔ وہ زندگی کی برکتوں کے حصول کی خاطر کوشاں بھی ہے اور عزم و استقلال کا پیغام بر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ عظمتِ انسانی کے تحفظ اور اعلا اقدارِ حیات کی بقا کا احساس ساحر کی غزلوں میں جا بہ جا نظر آتا ہے۔ اسی فکری تعمق نے ان کی غزلوں میں فلسفیانہ آہنگ بھی پیدا کیا ہے:

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم؟ مؤ

کشکولِ فن اٹھا کے سوئے خسرواں نہ جا
اب دستِ اختیارِ جم و کے میں کچھ نہیں مؤ

جس میں خلوصِ فکر نہ ہو وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو اس لے میں کچھ نہیں مؤ

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم مؤ

حرفِ انکار سربلند رہا
ضعفِ اقرار تک نہیں پہنچا ؎

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارہ نہیں ہوتی ؎

ساحر کی غزلیہ شاعری میں تغزل کی نشاندہی کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

وہ خارجی عوارض اور داخلی تاثرات کو سلیقے کے ساتھ سمو کر ایک آہنگ بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ان کے ہر مصرعے میں مادی محرکات و موثرات کے احساس کے ساتھ وہ کیفیت بڑے سلیقے کے ساتھ گھلی ملی ہوتی ہے جو بے ساختہ داخلی ابھار سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم کو اصرار ہے کہ ساحر نظم کہیں یا غزل ان کے کلام کی سب سے زیادہ ناگزیر اور ناقابلِ انکار خصوصیت غزلیت یا تغزل ہے۔ ؎۱۰

ساحر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خیالات جو صرف نظم کا حصہ ہو سکتے تھے ان کو غزل میں سمو کر غزلیہ شاعری کے مخالفین کے اُس خیال کی نفی کر دی کہ جدید خیالات کو اپنے اندر سمو لینے کی قوت غزل میں نہیں ہے، گو ساحر کی بعض غزلوں میں نظم کا تاثر نمایاں ہے لیکن یہ کیفیت وہیں پیدا ہوئی ہے جہاں نظم کا بیانیہ اور وضاحتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے ورنہ عام طور

۱۰؎ بحوالہ ساحر: شخص اور شاعر ص ۱۲۸

سے ساحر کی وہ غزلیں جن میں استعارات و تشبیہات کے ذریعہ خیالات کو موثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، یقیناً کامیاب غزلیں ہیں۔ ساحر اگرچہ مجروح کی طرح غزل کے بہت زیادہ پاس دار نہیں تھے کیوں کہ وہ ہیئت کے مقابلہ میں موضوع کو اہم سمجھتے تھے تاہم غزل کی وسعت و ہمہ گیری کے منکر بھی نہیں تھے چنانچہ نئی رمزیت اور نئے آہنگ کے ساتھ اُس آواز کو جو نظم سے مخصوص تھی، اجتماعی زندگی کی آواز سے ملا دیا۔ غزل کے اس داخلی تاثر کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن رقم طراز ہیں:

> غزل نجی تجربے کے عطر کو داخلی تاثر کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ وہ محض تجربے کو بیان نہیں کرتی، اس تجربے سے حاصل شدہ تاثر کی مرکزی کیفیت کو پیش کرتی ہے۔ اس لیے شاعر کسی نظریے کو جب تک تجربے میں اور پھر تجربے سے حاصل ہونے والی نجی تاثر کی کیفیت میں نہ ڈھالے غزل میں اسے پیش نہیں کر سکتا ایک بار یہ عمل ہو لے تو پھر غزل کی محض لفظیات خارج نہیں ہوتیں بلکہ ان کی توسیع ہو جاتی ہے اور رمز و ایما نئے معنی حاصل کرتے جاتے ہیں۔ [۱۱]

اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ خارجی حالات کو ذات اور فکر میں سمو لینے سے ہی داخلی تاثر پیدا ہوتا ہے اور ساحر کی غزلیہ شاعری میں جو دروں بینی پائی جاتی ہے وہ اسی داخلی تاثر کا کا پتہ دیتی ہے اور دراصل خارجی حالات کی اسی آگاہی اور تاثر نے ساحر کے اندر حزن کی کیفیت بھی پیدا کی ہے اور ان میں درد و غم کی بے پناہ ٹیسیں بھی بھر دی ہیں:

اب اے دلِ تباہ! ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے [۱۲]

[۱۱] غزل: مجروح سلطانپوری ص ۳

زندگی کو بے نیازِ آرزو کرنا پڑا
آہ! کن آنکھوں سے انجامِ تمنا دیکھتے ۔ مٔو فرد

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے ۔ مٔو فرد

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار امیدو!
بہت دکھ سہہ لیے میں نے، بہت دن جی لیا میں نے ۔ مٔو

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارمان نہ کر سکے ۔ مٔو

ساحر دل شکستہ بھی تھے اور دل زدہ اور دردمند بھی، اسی لیے درد کے کسی بھی منظر اور ظلم کے کسی بھی لمحہ کو برداشت نہیں کر پائے اور ایسی صورت میں ان پر جو اثرات مرتب ہوئے انھیں اپنی فکری صلاحیتوں کے ذریعہ عوام تک پہنچا دیا۔ بہ الفاظ دیگر اپنی محسوسات کو انھوں نے عوام کی حسیت سے جوڑ دیا۔ ساحر کی غزلوں کا یہ غنائی لب و لہجہ اسی تاثر اور صالح اور خلوص بھرے احساس سے عبارت ہے چنانچہ مضمون کوئی بھی ہو ان کی یہ بے باکی اور صاف گوئی ہر جگہ نمایاں ہے اور بقول علی سردار جعفری (ساحر) اپنی بے باکی کا اظہار سیاست سے لے کر امارت تک ہر محفل میں کرتا تھا۔ ۱۲۵
ساحر کی غزلیں عام مجلسی اور عوامی زندگی کے عمومی جذبات کی عکاس ہیں انسانی نفسیات پر ان کی گہری نظر، ان کی فکر اور جذبے کی آمیزش کا احساس

۱۲۵ بحوالہ فن اور شخصیت: ساحر لدھیانوی نمبر ص ۹۸-۹۷

دلاتی ہے اور ان کے تجربات و مشاہدات کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔
ساحر کی غزلیں رومان، انصاف اور امن پر محیط ہیں۔
انہی بنیادی موضوعات میں متعدد ذیلی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔
عشق کی ناکامی، عورت کا تقدس، دیر و حرم کا تضاد، سماجی کش مکش، اہلِ اقتدار کے ذاتی مفاد کے تحت سماجی اور انسانی اقدار کی پامالی، مذہب کے نام پر انسانی تقسیم کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ منافرت اور تہذیبی تعطل نے ساحر کے ذہن و دل پر ایسے کاری زخم لگائے کہ مجبور و مظلوم اور مفلس و معصوم عوام کے مصائب و آلام کا ناقابلِ تقسیم حصہ بن گئے اور تمام تر ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ کیوں کہ تاریخ انسانی کے مطالعہ نے ان پر یہ منکشف کر دیا تھا کہ سماجی و طبقاتی کش مکش کے ڈانڈے کسی نہ کسی شکل میں معاشی و اقتصادی جڑوں ہی میں پیوست ہیں اور یہ عہدِ رواں کا نہیں بلکہ صدیوں سے چلی آ رہی روایتوں کا ناقابلِ تقسیم حصہ ہیں۔ اور روایت کی یہ قدریں شکل بدل بدل کر ہر عہد میں زندہ رہی ہیں ساحر کی غزلوں میں یہ احساس تاریخی سیاق و سباق کے ساتھ ابھرا ہے:

نسل در نسل انتظار رہا
قصر ٹوٹے، نہ بے نوائی گئی ؎

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دکھ کی دھوپ کے آگے سکھ کا سایا ہے ؎

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انسان کا نصیب آج بھی ہے ؎

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی ؎

ان اشعار میں ساحر کا تاریخی شعور ان کی عصری حسیات اور سیاسی بصیرت سے ہم آہنگ ہو کر ایک وحدت بن گیا ہے۔

ہندستان کی جدوجہد آزادی تاریخی حیثیت کی حامل ہے کیوں کہ غلامی سے نجات کی خواہش زمانۂ قدیم سے جاری ہے اور ہر زمانے میں اعلا اور ادنیٰ قدروں کے بیچ تصادم رہا ہے، ہر دور میں تبدیلی کی خواہش عوام کا وتیرہ رہی ہے اور ہر عہد میں انسانی رشتے بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ کیوں کہ رشتوں کی یہ تبدیلی ہی قدروں کے تعین میں معاون ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر نیا نظام پچھلے نظام سے بہتر ہوتا ہے۔ تبدیلی کی یہ خواہش ہندستان میں آزادی کی شکل میں نمایاں ہوئی لیکن ساحر کے یہاں آزادی کا یہ تصور محض سیاسی آزادی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں سماجی و اقتصادی آزادی کی خواہش بھی مدغم ہے۔ اسی خواہش نے ساحر اور اس عہد کے دوسرے ترقی پسند شعراء کے اس احساس کو قوت بخشی کہ "آزادی کا آفتاب طلوع ہوگا تو غلامی، بے انصافی، جبر و استحصال، ظلم و ستم کے بادل چھٹ جائیں گے اور عوام کو آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے گا"[۱۲۵] اور آزادی ملی تو ضرور لیکن شکست خوردہ تاہم کچھ شعراء نے یہ سوچ کر اس کا استقبال کیا کہ کچھ بھی ہو ملک برطانوی سامراج کی گرفت سے آزاد تو ہوا لیکن ایک طبقہ وہ بھی تھا جس نے اس آزادی سے بیزاری کا اظہار کیا اور اسے جدوجہد آزادی کے سربراہوں اور انگریزی استعماریت کی کیادیوں کا نتیجہ قرار دیا۔ ساحر بھی انہی میں سے ایک تھے:

اپنی غیرت بیچ ڈالیں، اپنا مسلک چھوڑ دیں
رہنماؤں میں بھی کچھ لوگوں کا یہ منشا تو ہے

ہے جنھیں سب سے زیادہ دعویٔ حبِ وطن
آج ان کی وجہ سے حبِ وطن رسوا تو ہے

۱۲۵ آج کا اردو ادب: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۱۳۷

تقریباً تمام ترقی پسند شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن فیض کی نظم "یہ داغ داغ اجالا --- الخ" پر سردار علی جعفری کی تنقید نے تصور آزادی سے متعلق خیالات کے برملا اظہار کا راستہ کھول دیا چنانچہ آزادی ملک کے تعلق سے ترقی پسند شعراء نے بے شمار نظمیں اور غزلیں کہیں۔ ان میں کچھ تو ایسے تھے جو فیض کی روش پر ہی کاربند رہے لیکن چند شعراء ایسے بھی تھے جنہوں نے وقتی سیلاب میں بہہ کر خیالات و نظریات کے برملا اظہار کو اپنا فرض تصور کیا۔ علی الرغم اس کے ساحر کی غزلوں میں سحر انگیزی اور تہہ داری برقرار رہی جس نے ان کے شعری آہنگ کو بھی نکھیر کیا اور ان کے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کی:

خونِ اعدا سے نہ ہو، خونِ شہیداں ہی سے ہو
کچھ نہ کچھ اس دور میں رنگِ چمن نکھرا تو ہے ؎

اس قدر لطیف طنز اس دور کی غزلوں میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ باوجود اس کے ساحر کے یہاں مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت نہیں ملتی بلکہ عزم و حوصلے کا احساس ابھرتا ہے جو ان کے تاریخی شعور کی دین ہے:

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم ؎

لیکن تقسیم ہند کے بعد ملک میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری کا اردو ادب پر بہت نمایاں اثر پڑا۔ "ادیب جو فطرتاً امن پسند اور انسان دوست ہوتا ہے ایسے خوں چکاں ماحول میں کم از کم قلمی جدوجہد تو کر ہی سکتا ہے"۱۳۱ شعراء نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعہ اس

۱۳۱ بمبئی کی بزم آرائیاں: رفعت سروش ص ۶۵

بحرانی حالات پر اپنے افسوس اور درد و غم کا اظہار کیا اور شدید طنز کا پیرایہ اختیار کیا۔ افسانوی ادب میں کرشن چندر کا افسانہ پشاور ایکسپریس سعادت حسن منٹو کا سیاہ حاشیے، خواجہ احمد عباس کا سردار جی تقسیم ہند سے پیدا شدہ معاشی و معاشرتی حالات کی زندہ اور متحرک تصویریں ہیں۔

ساحر کی چھپے شعر کی یک موضوعی غزل اسی احساس کی کڑی ہے ان کے نزدیک تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ مسائل کی پیچیدگیاں نہ صرف اتحادِ قومی کے لیے خطرہ تھیں بلکہ سیاسی و سماجی قدروں کی شکست و ریخت کا موجب بھی تھیں:

طرب زاروں پہ کیا بیتی؟ صنم خانوں پہ کیا گزری ؟
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری ؟
زمیں نے خون اگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے، تو انسانوں پہ کیا گزری ؟
ہمیں یہ فکر ان کی انجمن کس حال میں ہوگی
انھیں یہ غم کہ ان سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری ؟
مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری ؟
یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری ؟
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری ؟

اس پوری غزل میں علامات و استعارات کے ذریعہ جس طرح کی فضا قائم ہوئی ہے وہ جذبہ و احساس کو چھو کر گزرتی ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فسادات پر نثر و نظم دونوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔
لیکن ان میں سے بہت کم چیزیں زندہ رہ سکیں یا رہیں
گی۔ خود ساحر نے بھی فسادات پر نظمیں اور غزلیں لکھی
ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فسادات پر لکھی جانے والی شاعری
میں ساحر کی یہ غزل ؎

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

کامیاب ترین غزلوں میں سے ہے اور اس کے چھ شعروں میں
سے ہر شعر جو زبان زدِ عام ہے۔ بہت ممکن ہے کل بھی زندہ رہے۔[۱۵]

عصرِ حاضر کے اس تاجرانہ ماحول میں ایک طرف مصلحت پسندی، اقربا پروری
خود غرضی اور مفاد پرستی استعماری قوتوں اور سیاسی شاطروں کا نصب العین
بنی تو دوسری طرف ہمدردی، ایمان داری اور جذبۂ اخلاص و ایثار اور
ترحم و ہمدردی بے معنی قرار پایا۔ دروغ گوئی اور فریب و دغا بازی شیوہ
بنی اور مفاد مقصد۔ حق و صداقت بے یار و مددگار ٹھہری اور علم و ہنر اور
شعور و آگہی بے مقصد اور لایعنی۔ عصری سماج کی یہ حقیقتیں ساحر کے شعور و فکر
میں ڈھل کر زندہ ہو گئی ہیں:

منصفِ شہر کی وحدت پہ نہ حرف آ جائے
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ جفا اور بھی ہیں ؎

جھوٹ تو قاتل ٹھہرا، اس کا کیا رونا
سچ نے بھی انساں کا خوں بہایا ہے ؎

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے جن کی صورت جنھیں دکھائی گئی ؎

۱۵ بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی ساحر لدھیانوی نمبر ص ۲۸۸

جھوٹ کیوں بولیں فروغِ مصلحت کے نام پر
زندگی پیاری سہی، لیکن ہمیں مرنا تو ہے

پھر انتظامیہ کے جبر و تشدد اور منافقانہ رویوں پر بھی نشتر زنی کی ہے اور ہندستان میں لسانی مسئلہ اور تنازعہ کی صورت میں اردو کے حقوق کی پامالی کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی ہے اور کہنے کو تو ہم آزاد ہندستان میں اپنے جمہوری حقوق کے ساتھ زندہ ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ متوسط اور پسماندہ طبقہ آج بھی عدم تحفظ کا شکار ہے اور تشدد اور فرقہ پرستی کے اس ماحول میں معصوم اور بے گنہ لوگ ہی معتوب ہوتے ہیں۔ ساحر کی غزلوں میں طنزیہ اسلوب کے ساتھ سارا منظر بے حجاب ہوا ہے:

لب پہ پابندی تو ہے، احساس پر پہرا تو ہے
پھر بھی اہلِ دل کو احوالِ بشر کہنا تو ہے

اس دورِ احتیاج میں جو لوگ جی لیے
ان کا بھی نام شعبدہ کاروں میں آئے گا

حکمِ سرکار کی پہنچ مت پوچھ
اہلِ سرکار تک نہیں پہنچا
عدل گاہیں تو دور کی شے ہیں
قتل اخبار تک نہیں پہنچا
انقلاباتِ دہر کی بنیاد
حق جو حق دار تک نہیں پہنچا

ستم کے دور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

زندگی کے تجربے اور حالات و ماحول کے مشاہدے کی قوت کے ذریعہ ساحر نے اپنی غزلوں میں روحِ عصر کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ ان کی غزلیں عصری حسیت کی آئینہ دار بن گئی ہیں پھر تاریخ اور اقتصادیات کے عمیق مطالعہ نے ان کے ذہن کو بالیدگی بخشی ہے اور ان میں ایسا تنقیدی شعور پیدا کیا ہے جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر زندگی کے اس رخ کی عکاسی کرتا ہے جہاں گھٹن اور بےبسی کے باوجود زندگی خواب نہیں حقیقت بن جاتی ہے اور ایسا تاثر قائم ہوتا ہے جو جدوجہد کی لگن اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر منور انجم ساحر کی غزلیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان کے کلام میں تغزل کا سرمایہ یقیناً محدود ہے پھر بھی ان کی غزلیہ شاعری میں عشقیہ خیالات اور سیاسی حالات کے ساتھ حیاتِ انسانی کے دوسرے مسائل کا تذکرہ بھی نہایت موثر انداز میں ملتا ہے ان کی غزلوں کے ہر شعر کی انفرادیت مسلّم ہے اور ہر جگہ تغزل کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ۱۶ے

ساحر کے یہاں تغزل کی یہ کیفیت ان کی بےساختگی اور برجستگی کا احساس دلاتی ہے۔ کیوں کہ اول تو ان کی غزلوں میں ابہام کا شائبہ تک نہیں ہے دوسرے یہ کہ اشتراکی فلسفہ کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ ملتا ہے لہذا انقلاب کے تئیں ان کا رویہ نعرہ بازی والا نہیں ہے بلکہ درد و کرب اور محرومی و ناکامی سے پیدا شدہ سوز و گداز کی کیفیت سے مربوط ہے۔ اسی کیفیت نے ساحر کو ولولہ انگیز اور پرشکوہ الفاظ کے استعمال سے بھی عام طور پر محفوظ رکھا ہے کیوں کہ ساحر کی غزلیں ان کے جذبات و احساسات کا اظہار ہیں سیاسی پروپیگنڈے کا وسیلہ نہیں اور اظہار کے اس سانچے کو انھوں نے آسان اور سلیس مگر خوبصورت الفاظ سے بھی

۱۶ے اردو ادب کے ماہ و انجم ص ۱۰۹

مرتب کیا ہے اور قدیم و جدید تشبیہات و استعارات کے ذریعہ تزئین بھی کیا ہے۔

ساحر کے یہاں غزلوں کی فضا عام طور سے استعاروں سے استوار ہوتی ہے اور اشعار میں تاثیر کی کیفیت نئے تشبیہی علاقہ رکھنے والے استعاروں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ استعارے اردو مرکبات کی صورت بھی اجاگر ہوئے ہیں اور فارسی تراکیب کے ذریعہ بھی تراشے گئے ہیں اسی طرح علامتوں کے معاملے میں بھی ساحر نے اجتہاد کیا ہے کیوں کہ کلاسیکی شاعری میں عام طور سے علامتوں کا استعمال انفرادی آلام و مصائب تک محدود تھا البتہ چند شعراء نے سماجی و سیاسی حالات کو علامتوں کے پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں انفرادی مسائل زیادہ اہم رہے ہیں۔ ساحر نے بھی اگرچہ علامتوں کو ذاتی دکھ درد کے طور پر اپنایا ہے لیکن ساحر کا دکھ درد بھی ان کے طبقاتی احساس سے معمور رہا ہے لہذا یہ علامتیں ان کے تاریخی و اجتماعی شعور کی پہچان بھی ہیں اور ان کی سیاسی بصیرت کی ترجمانی بھی:

زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی مو

بجھ رہے ہیں ایک اک کر کے عقیدوں کے دیے
اس اندھیرے کا بھی لیکن سامنا کرنا تو ہے مو

اے روحِ عصر جاگ کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے مو

گیسوؤں کی چھاؤں میں دلنواز چہرے ہیں
یا حسیں دھندلکوں میں پھول ہیں چناروں کے مو

ادھر بھی خاک اڑی ہے ادھر بھی زخم پڑے
جدھر سے ہو کے بہاروں کے کارواں نکلے مو

تم نے صرف چاہا ہے، ہم نے چھو کے دیکھے ہیں
پیرہن گھٹاؤں کے، جسم برق پاروں کے مو

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دکھ کی دھوپ کے آگے سکھ کا سایا ہے ؎

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری؟ ؎

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں
اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے ؎

قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہش بال و پر کیجیے ؎

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انسان کا نصیب آج بھی ہے ؎

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے ؎

ان اشعار کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحر نے روایتی بحروں میں ہی نئے قافیے اور نئی ردیفیں استعمال کی ہیں اور ان بحور و قوافی میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ عصری صداقتوں کو پیش کیا ہے بہ الفاظ دیگر ساحر نے ان استعاروں اور علامتوں کو نئے معنی و مفاہیم بھی دیے ہیں اور سیاسی رمزیت سے بھی آشنا کیا ہے۔

یہی صورت تشبیہات کے انتخاب و استعمال کی ہے۔ ساحر نے اجنبی تشبیہوں سے پرہیز کرتے ہوئے روایتی تشبیہات سے کام لیا ہے لیکن روایتی کا مفہوم وہ نہیں جن کو شعراء برتتے آئے ہیں، بلکہ ساحر کے یہاں یہ تشبیہات عصری تقاضوں کو نمایاں کرتی ہیں اور تجربات و مشاہدات کے اظہار کا وسیلہ اور افکار و خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ساحر کے یہاں تشبیہات کی حسی اور عقلی دونوں اقسام استعمال میں لائی گئی ہیں جو ان کی تخیلی قوت کا

احساس دلاتی ہیں:

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم مٔو

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم مٔو

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارہ نہیں ہوتی مٔو

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے مٔو

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری؟ مٔو

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے مٔو

ساحر کے یہاں تشبیہات عام طور سے شعر کا حصہ بن کر آتی ہیں اور احساسات پر فوری اور یک لخت چھا جاتی ہیں اس لحاظ سے جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا، یہ تشبیہات، جذبہ و احساس کے ترسیل کا زیادہ موثر ذریعہ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالوحید ساحر کے اسلوب اور فن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

ساحر کا اسلوب نہایت دلکش، واضح اور منفرد ہے ۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے اور وہ قانون، مذہب یا سماج جس پر قلم اٹھاتا ہے تو دور از کار استعاروں اور اجنبی تشبیہوں کے بجائے نہایت نرم و نازک اشارات سے کام لے کر ایسی جچی تلی باتیں کرتا ہے کہ پڑھنے والے ان باتوں سے محظوظ اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۱۷۰

ساحر بے جان چیزوں کو جاندار بنانے اور اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرنے کے ماہر ہیں، اور اس سے ساحر کے اسلوب کی رنگا رنگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ صورت نہ صرف ان کے بیانیہ اشعار میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ خطابیہ کلام میں بھی یہ رنگ نمایاں ہوا ہے بہ الفاظ دیگر جہاں انھوں نے خطابیہ انداز اختیار کیا ہے نہ صرف شعر کا حسن بڑھ گیا ہے اور شعر کی غنائی کیفیت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ بے جان اور غیر مرئی اشیاء کو گویائی بھی دے دی ہے :

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار امیدو !
بہت دکھ سہہ لیے میں نے، بہت دن جی لیا میں نے ؎

اے آرزو کے دھندلے خرابو! جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے ؎

اے روحِ عصر! جاگ کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے ؎

۱۷۰ جدید شعرائے اردو ص ۹۲۵

ساحر کی غزلوں کا ایک خاص وصف وہ اردو مرکبات اور فارسی تراکیب ہیں جن کے برجستہ اور برمحل استعمال سے اشعار اور بھی پرتاثیر اور دلکش ہو گئے ہیں ان میں کچھ تو کلاسیکی شاعری سے مستعار ہیں کچھ نئی ہیں اور کچھ اختراعی ہیں لیکن تمام ترکیبیں جدید لب ولہجہ سے ہم آہنگ ہیں۔ اردو مرکبات سے پیکر تراشی کا کام لیا گیا ہے جو ساحر کے شعری مزاج اور خصوصیاتِ شعری کا احساس دلاتے ہیں۔ مثلاً روایتی اور جدید و اختراعی تراکیب یہ ہیں:

غمِ روزگار، عہدِ وفا، نظمِ گلستاں، پردۂ شب،
مسلکِ شوریدہ سری، خواہشِ بال وپر، لبِ تشنۂ اوہام، عروسِ آگہی،
بے نیازِ عبرتِ انجام، مسلکِ شوریدہ سری، سوئے کوئے ملامت،
اسیرِ حلقۂ نیک وبدِ عالم، علاجِ شوقِ گریزاں، محورِ احساس وغیرہ

یہ ترکیبیں محض الفاظ کا دروبست نہیں ہیں بلکہ گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں اور اپنے اندر نہ معلوم کتنی معنوی تہیں چھپائے ہوئے ہیں۔ اردو مرکبات نہ صرف پیکر تراشی میں معاون ہوئے ہیں بلکہ استعارے تشکیل دینے میں بھی ممد ہوئے ہیں:

تم نے صرف چاہا ہے، ہم نے چھو کے دیکھے ہیں
پیرہن گھٹاؤں کے، جسم برق پاروں کے ؎

اے روحِ عصر جاگ! کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے ؎

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سلگتے ہیں زخم رہگزاروں کے ؎

اے آرزو کے دھندلے خرابو! جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے ؎

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دکھ کی دھوپ کے آگے سکھ کا سایا ہے ؎

ان کے علاوہ دوسرے مرکبات یہ بھی ہیں:
کفر کا گھر، نفس کا لوچ، صبح کا دامن،
زمین کا خون اگلنا وغیرہ

یہ مرکبات ساحر کے اپنے مزاج، ان کے احساس و شعور اور ان کے درد و غم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان مرکبات کا استعمال ساحر نے شدت جذبات کو حقیقی رنگ دینے کے لیے کیا ہے۔

یہی صورت ساحر کے یہاں متقدمین اور متاخرین شعراء سے استفادے یا اثرات کی ہے اور اگرچہ ساحر نے اقبال، جوش، فیض اور مجاز کے اثرات کا ذکر خود کیا ہے لیکن ماقبل شعراء کا اثر بھی کہیں کہیں منعکس ہوتا ہے۔ مثلاً

فیض کے اس شعر کی موضوعی مماثلت ملاحظہ ہو، صرف پیرایۂ اظہار بدلا ہوا ہے:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے ؎ فیض

میں، اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے ؎ ساحر

غالب کا شعر ہے:

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا ؎

اس شعر کا اثر ساحر کے اس شعر میں دیکھا جا سکتا ہے:

ہوس ہو گی اسیرِ حلقۂ نیک و بدِ عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی ؎

اسی طرح آتش کے شعر سے استفادہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے:

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے ؎ خواجہ حیدر علی آتش

زمیں نے خون اگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری ؎ ساحر

آتش کے یہاں ذاتی غم علامتوں کے ذریعہ اجاگر ہوا ہے جب کہ ساحر کے یہاں سماجی شعور، سیاسی بصیرت سے ہم آہنگ ہوا ہے اور یہی ساحر کا فنی نکتہ ہے۔

کسی شاعر کا شعر ہے:

یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں ؎ نامعلوم

یہ شعر بجائے خود بہت خوبصورت اور حوصلہ افزا شعر ہے لیکن ساحر کا یہ شعر:

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دکھ کی دھوپ کے آگے سکھ کا سایا ہے ؎

اس شعر میں ساحر کا تاریخی اور مادی شعور رہنما ہے لہٰذا یہ شعر معنوی تہہ داری کے ساتھ عصری حسیت کا عکاس بن گیا ہے۔

الغرض کہہ سکتے ہیں کہ ساحر کی غزلوں میں ہر چند کہ رومانیت کی رنگینیاں جلوہ گر ہوئی ہیں لیکن یہ رنگینیاں بھی حقیقت کی سنگینیوں سے ہم آہنگ ہیں۔ بایں ہمہ احساسِ عشق کی بدولت ہی ساحر میں ہم دردی و غم گساری کا جذبہ بھی بیدار ہوا ہے۔ لہٰذا ہر اس مقام پر، خواہ وہ مظلوم و مجبور عوام کے آلام و مصائب ہوں یا طبقاتی تضاد سے پیدا شدہ معاشی و معاشرتی مسائل، ساحر کا دل ہر مظالم کے خلاف آمادۂ احتجاج ہوا ہے اور عوام کے بےکس دل کی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکا ہے۔